Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

Symbolic System in Asif Farrukhi's Fiction

آصف فرخی کے افسانوں میں علامتی نظام

[1]Zahida Bibi, [2]Dr. Zafar Hussain Harral
[1]Ph.D Scholar (Urdu), [2]Associate Professor, Department of Urdu, BZU, Multan.
Correspondence Email: zafarharral@googlemail.com

pISSN: 3007-2077
eISSN: 3007-2085

HEC approved in **Y** category.

Received: 30-12-2024
Accepted: 09-01-2025
Online: 13-03-2025

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2024 by the author(s).

Abstract

Symbolism has been extensively used under the progressive literary movement in Urdu literature. In this study, short stories of Asif Farrukhi have been critically evaluated from the perspective of symbolism. He applies and uses symbolism in his short stories according to the situation and demand of the plot and story. This use of symbolic technique makes his communication more effective and distinguishes his literary figures from his contemporary literary figures.

Dr. Asif Farrukhi, a prominent figure in Urdu literature, is celebrated for his multi-faceted contributions as a teacher, writer, editor, and translator. His short stories masterfully blend realism, abstraction, and symbolism, using metaphors that are relatable and thought-provoking. Stories like "Deemak" ("Termite") and "Yazid Ki Pyas" stand out for their allegorical depth, addressing social decay and existential questions.

Farrukhi's storytelling seamlessly incorporates mythology, folklore, and contemporary societal issues, often reflecting the urban chaos of Karachi. His unique narrative style resonates with readers, offering both literary sophistication and accessibility. In politically turbulent times, he skillfully employed symbolism to articulate societal challenges.

Rejecting literary conformity, Farrukhi forged a distinct identity in modern Urdu fiction. His straightforward yet evocative language ensures even complex symbols are comprehensible. Scholars praise his broad vision and innovative approach, cementing his legacy as a pioneer of original and impactful storytelling in Urdu literature.

Keywords:

Asif Farrukhi, Urdu Short Story, Symbol, Symbolism, Symbolic Technique

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

آصف فرخی کا نام آصف اسلم فرخی تھا لیکن ادبی دنیا میں انہیں آصف فرخی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ناظم آباد کراچی میں پیدا ہوئے۔ اردو کے معروف ادیب اسلم فرخی کے بیٹے ہیں، جنہیں اردو کی نامور شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے - آصف فرخی کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے ادبی اور خاندانی ماحول کا گہرا عمل دخل ہے۔ آصف فرخی نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو ایک ادبی ماحول میں پایا اور اپنے گھر میں مختلف ادبی شخصیات کی آمد و رفت کو دیکھا جس نے ان کے شوق کو مہمیز دی۔ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۷۸ء ہی میں ہو گیا تھا۔ اپنی پہلی کہانی رسالہ "اظہار" میں چھپنے سے ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔

آصف فرخی بنیادی طور پر ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں جو بیک وقت افسانہ نگار، نقاد، مترجم، مدیر اور استاد ہیں۔ بطور افسانہ نگار ان کے آٹھ تنقیدی مجموعے، تین تنقیدی مضامین کی کتب، ایک انٹرویو پر مبنی کتاب اور اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی ادب کے تراجم کی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے پاکستانی ادب کو بھی انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے "دنیازاد" کے نام سے اکتوبر ۲۰۰۰ میں ادبی رسالہ جاری کیا۔ جسے ادب کی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ لیکن ان کے فن کا سب سے بڑا حوالہ افسانہ ہے۔

افسانے کے فن میں انہیں بہت زیادہ توجہ ملی کیونکہ روزمرہ زندگی کے مسائل اور معاشرتی مسائل کو جس طرح افسانوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں اسی پاکستانی معاشرے کے الفاظ کی ہی گونج سنائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ آصف فرخی پاکستانی معاشرے کے اس گونج کو عام عوام تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجریدیت، اساطیریت اور علامت کے بہت زیادہ تجربے کیے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کراچی کے حالات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے افسانے کی اس طرح تعریف کی ہے، رابرٹ بوئٹن نے لکھا ہے:

> "کہانیاں وقوع پذیر نہیں ہوتیں انہیں تخلیق کرنا پڑتا ہے حالانکہ کہانی وقوع پذیر ہی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ سماج اور دوسری مرتبہ کہانی کہنے والے کے اندر اور کبھی یہ ترتیب الٹ بھی جاتی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> "کہانی بلاشبہ سماج کی پیداوار ہے۔ مگر یہ سماج کو پیدا بھی کرتی ہے۔ افسانے کا ہر روپ انسانوں کی جذباتی حسی اور فکری پرداخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔"(۲)

رابرٹ بوئٹن نے لکھا ہے:

> "ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر طاری کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

یہ افسانہ ہے۔"(۳)

قصہ، کہانی ہر دور میں مقبول رہی ہے اور لوگوں کے لئے دلچسپی کا سبب بنی ہے۔ پرانے وقتوں میں جب لوگ مل جل کر بیٹھتے تھے اور دن بھر کی تھکان اور بوریت دور کرنے نے لوگوں کو کہانی کہنے کی طرف راغب کیا۔ لوگوں نے مختلف واقعات کے اصولوں کے ساتھ اور دلچسپ انداز میں بیان کرنے کا انداز سیکھ لیا جس کی وجہ سے سننے والوں نے اس واقعے کو یاد رکھنا شروع کر دیا جس کی بنا پر کہانی نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دی۔ جس سے کہانی کہنے کے انداز میں تبدیلی آتی گئی۔ کہانی کو جن خصوصیات کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی ان میں ان کی ساخت، اسلوب اور فنی باریکیوں میں مختلف قسم کی تبدیلی نے کہانی کو شہرت عطا کی۔ قصہ کا رواج ۱۸۰۰ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوا۔ اس کے ذریعے وسیع پیمانے پر قصہ کہانی اور داستانوں میں اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے کہانیوں کی طباعت اور اشاعت کے مسائل بہت زیادہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج کا جب قیام ہوا اس کے بعد وسیع پیمانے پر کہانیوں اور داستانوں کی اشاعت ہونے لگی۔ ان داستانوں میں باغ و بہار نثر بے نظیر کے علاوہ اور بھی بہت سی داستانیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے توسط سے شائع ہوئیں لیکن مقبول نہ ہو سکیں۔

ان داستانوں میں جس طرح کے الفاظ کا ذخیرہ استعمال ہوا اس سے اردو ادب نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اس سے اردو ناول اور افسانے کی صورت میں ہوا۔ ان ذخیرہ الفاظ سے اردو ناول اور افسانے کا راستہ بہت ہموار ہوا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ تلاش روزگار کے سلسلے میں گاؤں سے شہر کی طرف رخ کرنے لگے جس کی وجہ سے وقت کی قلت ہونے لگی لوگوں کے پاس لمبی لمبی داستانوں اور کہانیوں کے لئے وقت نہیں رہا تو اس وقت کی قلت کا حل مختصر افسانے کی صورت میں نکالا گیا۔

افسانہ چونکہ بہت ہی کم وقت میں پڑھا اور لکھا جاتا ہے جس کی بنا پر افسانہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مختصر افسانے کو اس کی مختلف قسم کی تبدیلیوں نے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا کیوں کہ مختصر افسانے میں افسانہ نگار قوت مشاہدہ اور تخیل کی بنا پر انسانی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اختر حسین اور ینوی کہتا ہے:

> "ایک اچھا افسانہ ایک کامیاب ڈرامہ کی طرح معجزہ ہے ایجاز کے باوجود اختصار کے فن کی حیثیت سے وہ ایک حسن کامل ہوتا ہے اور اپنے حسن و تکمیل کی وجہ سے ناظرین کیلئے ذہنی مسرت کا سامان ہے۔"(۴)

افسانے کی خاصیت کے حوالے سے ڈاکٹر احتشام حسین نے کہا ہے:

> "ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں جو چیز مابہ الامتیاز ہو گی جو چیز فرق پیدا کرنے والی ہو گی وہ صرف لمحے کی لذت ہو گی جس لمحہ میں پڑھنے والے نے وہ افسانہ پڑھا ہے۔"(۵)

مختلف مفکرین نے اردو افسانے کی مختلف تعریفیں کی ہیں. H.E Bates نے اس فن کی مشکلات کو اس طرح بیان کیا ہے:

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

"کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ ایک تنکا اڑا دھم کر کے سب کو گرا دیتا ہے۔"(۶)

ڈاکٹر انوار احمد نے "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" میں مختصر افسانے کی کی تعریف اس طرح کی ہے:

"مختصر افسانہ ایک نثری بیانیہ ہے جس کے پڑھنے میں آدھے گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ آدھے گھنٹہ کے اندر پڑھا جانے والا فن پارہ ہے۔"(۷)

اس کے علاوہ جیرالڈ پرنس نے اپنی کتاب "اے گرامر آف سٹوری" میں مختصر افسانے کی اس طرح تعریف کی ہے۔ مختصر افسانہ کی کوئی بھی قسم ہو اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہو سکتی جب تک تین یا زیادہ واقعات ایک دوسرے سے نہ جڑے ہوں یہی وجہ ہے کہ ان میں دو واقعات کا مختلف وقت میں وقوع پذیر ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر وقار عظیم مختصر افسانے کے بارے میں کہتے ہیں:

"مختصر افسانہ ایک ایسی نثری داستان ہے جسے ہم با آسانی آدھے گھنٹے سے لے کر دو گھنٹہ میں پڑھ سکیں اور جس میں اختصار یا سادگی کے علاوہ اتحاد اثر اتحاد زبان و مکان اور اتحاد کردار بدرجہ اتم موجود ہو۔"(۸)

اس کے علاوہ وقار عظیم اپنی کتاب "فن افسانہ نگاری" میں افسانہ کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"مختصر افسانہ ایک مختصر تخیلی تخلیق ہے جس سے کسی ایک مخصوص واقعے یا مخصوص کردار کا نقش پلاٹ کے ذریعے اس طرح ابھارا جاتا ہے۔"(۹)

اردو افسانے کی تعریفوں کے علاوہ اگر اس کی شروعات کی بات کی جائے تو اس کی ابتداء پریم چند سے ہوئی اور مختلف افسانہ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اردو افسانے میں مختلف رجحان بھی آئے جنہوں نے اردو افسانے کی ساخت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عالم خان کہتے ہیں:

"قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے تمام رجحانات میں ایک بات اہمیت کی حامل ہے وہ فرد کی بے بسی اور تنہائی ہے جس کے نتیجے میں اسے اپنے تشخص کے بحران سے دوچار ہونا پڑا اس نئی سرزمین میں پناہ نہ مل سکی وہ صرف تہذیبی و ثقافتی انتشار ہو بلکہ اسے ذہنی و فکری جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔"(۱۰)

اردو افسانے نے اپنے دامن میں مختلف اصولوں اور مقاصد کو جگہ دی ہے ان میں ترقی پسندی تحریک کے اصول اور مقاصد زیادہ نمایاں ہیں جن میں اظہاریت، تصوریت، شعور کی رو، ماورا حقیقت، وجودیت، حقیقت اور علامت زیادہ نمایاں ہیں۔ اردو افسانے میں علامت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اُردو افسانے میں علامت کی ابتدا ۱۹۵۵۔۱۹۶۰ کے درمیان ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

"اردو افسانے پر علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ علامتی افسانے کا شانہ روایتی افسانے سے ملا ہوا

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

ہے۔"(۱۱)

سلیم اختر کے مطابق:

"علامتی اور تحریری افسانہ نگار آج کی پیداوار معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا آغاز اتنا اچانک نہیں جتنا بعض اوقات قارئین کے ردِ عمل سے محسوس ہوتا ہے۔"(۱۲)

علامت کی مختلف مفکرین نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بنیادی طور پر لفظ سمبل (Symbol) جس کے لئے ادب میں علامت کی اصطلاح ہے۔ یونانی لفظ Symbol سے نکلا ہے اور خود یہ لفظ دو لفظوں Sym اور Bolon کا مرکب ہے۔ پہلے لفظ کا مطلب "ساتھ" اور دوسرے کا "پھینکا ہوا"، چنانچہ پورے لفظ کا مطلب ہے "جسے ساتھ پھینکا گیا"۔ اصل یونانی مفہوم میں اس کا استعمال کچھ یوں تھا کہ دو فریق کوئی چیز مثلاً (چھڑی یا سکہ) توڑ دیتے تھے اور بعد میں ان فریقوں کے درمیان کسی معاہدے کی شناخت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ تجارت کرنے والوں میں بھی اس طرح کی چیزیں کسی معاہدے کی شناخت اور خرید و فروخت شدہ چیزوں کی تعداد کا تعین کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ اس طرح سمبل کا مطلب ہوا کسی چیز کا ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے ساتھ رکھا جائے یا ملایا جائے تو وہ اصل مطلب کو زندہ کر دے یا یاد دلا دے جس کا وہ شناختی نشان ہے۔ گویا ہماری ذات کے اس حصے سے جسے ہم فراموش کیے ہوئے ہیں ملا کر علامتیں زندگی سے ہمارے انقطاع اور ہماری شکستگی کو مندمل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔(۱۳)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں علامت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"Symbol the term given to a visible object representing to the mind. The symbolence of something which is not grown but realized by association with it."(۱۴)

یعنی علامت وہ اصطلاح ہے جو کسی مرئی دکھائی دینے والی شے کو دی گئی ہے جو ذہن کی رہنمائی کر کے کسی چیز کی اس مشابہت کی طرف جو دکھائی نہیں گئی ہو بلکہ اس کے تلازمے سے پہچان جاتی ہو۔ جارج ویلی نے "پوئٹک پروسیز" میں علامت کے حوالے سے کہا ہے:

"لفظ علامت ایک اسم ہے جو یونان زبان کے فعل سے مشتق ہے اس لفظ کے معنی کشیدہ اتفاق، مقابلہ، اتحاد اور باہم متحد کرنا ہے۔"(۱۵)

سی ایس یورس نے علامت (Symbol) کا تعلق یونان سے بتایا، وہ لکھتا ہے:

"علامت ہم تک یونان سے آئی اور پہلی بار نمایاں اور بااثر طور پر مغربی افکار میں مکالمات افلاطون کے ساتھ ظاہر ہوئی۔"(۱۶)

شاد حسین کسیر اور لینگر نے علامت کی تشکیل پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ نشان ایک علامتی حیوان (Symbol Animal)

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

ہے جس کی زبانیں، اساطیر، مذہب، علوم وفنون وہ علامتی ہیئتیں ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی حقیقت متشکل کرتا رہتا ہے اور اس کا عرفان حاصل کرتا ہے۔(۱۷) افسانوں میں علامت نگاری کی ابتدا سیاسی استبرادی اور سائنسی ترقی کے رد عمل میں ہوئی۔ علامت کی تعریف کی جائے تو کچھ اس طرح ہے:

> "کسی بھی لفظ کا ایسا مخصوص استعمال جو اپنے ظاہری معنی کے علاوہ کسی گہرے اور تہہ دار کے معنی کو پیش کرے علامت کہلاتا ہے۔"(۱۸)

علامت کو مختلف حصوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں اشارہ سراغ، عنایہ کے علاوہ اصطلاحی مفہوم میں علامت نمائندگی کرنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں علامت کو لفظ یا شے کو ایک کردار یا تصور کو ایک مقصد کے لیے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علامت انسان کی بصری، صوری، خیالیاتی اور ذہنی فکری اور عقل وفہم کی وسیع عملی مفاہیم بیان کرتی ہے جب انسان کے جذبات خیالات اور احساسات کو ابلاغ اور ترسیل کی ضرورت ہوتی ہے تو علامات اشاروں کنایوں کی صورت ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے علامتی نظام نہ محسوس طریقے سے زمانہ قدیم سے لے کر آج تک انسان کے اظہار کا ذیعہ بنتا رہا اور انسان کے اظہار کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوا۔

سائنس چاہے جتنی بھی ترقی کرلے یا زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو علامت کا ایک الگ مقام ہے دنیا کی کوئی بھی چیز چاہے وہ ظاہری ہو یا باطنی علامت کے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہی وہ علامت کے بغیر اپنا مفہوم ادا کر سکتا ہے اس کی مختلف مثالیں دی جاسکتی ہیں جیسا کہ سفید جھنڈا لہرا رہا ہو تو وہ امن کی علامت ہو گا جبکہ اس کے برعکس اگر کالا جھنڈا لہرا رہا ہو گا تو وہ سوگ یا غم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو علامت کو عرصہ دراز سے علامت کو استعمال کیا گیا ہے_ لیکن انیسویں صدی میں علامت نگاری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی کیونکہ انسان اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی چیزوں کی پہچان کیلئے علامت کا ہی استعمال کیا ہے اور ان چیزوں کو پہنچان کیلئے نام دیے جو بنیادی طور پر علامت کے زمرے میں آتے ہیں۔

دنیائے ادب میں علاقائی طرزِ بیان، ادب وسیاست، تجارت ومعیشت، فن وفلسفہ کے جتنے بھی میکانزم ہیں ان پر علامتی نظام شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کی وضاحت یا مفہوم کی صراحت کے لیے علامت کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مشینری چیزوں میں بھی علامتی اظہار وعمل نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مجید مضمر کے مطابق:

> "علامت سازی کا عمل بھی انسان کے بنیادی اعمال میں سے ایک ہے جو کھانے، پینے، چلنے جیسے اعمال کی طرح ہر لمحہ اور ہر وقت انسانی ذہن سے وابستہ رہتا ہے اور انسانی ذہن مختلف احساسات، تلازمات اور اشیا کے بنیادی رشتوں کو علامتی شکل میں ڈھالتا رہتا ہے۔"(۱۹)

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

علامت کی کچھ قسمیں بھی ہیں جی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ان میں روایتی علامتیں ان علامتوں میں ایسی علامتیں ہوتی ہیں جو بہت عرصے تک اپنا وجود برقرار رکھنے کے بعد انسان کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔

آفاقی علامتیں ایسی علامتیں ہوتی ہیں جو بین الاقوامی سطح پر رنگ نسل عقائد کی حدود کو توڑتی ہیں جو ہر طرح کے لوگوں پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی ہیں جیسے ہجر، رات، دن، بہار، خزاں وغیرہ۔ شخصی یا ذاتی علامتوں میں فرد کی نفسیات اور فرد کی ذات ان علامتوں کا تعلق ہوتا ہے یہ علامتیں فرد کی اپنی ایجاد کردہ علامتیں ہیں۔(۲۰)

مختلف دبستان سے تعلق رکھنے والے مفکرین نے علامت کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں۔ ان قسموں کے علاوہ نفسیاتی دبستان سے تعلق رکھنے والے فرائڈ نے علامتوں کی دو قسمیں "دائمی" اور "عارضی" بتائی ہیں۔ عارضی علامت عصر پھوٹتی ہے جبکہ دائمی علامت، لوک ورثہ اساطیر، روایت اور قدیم مذہبی دروبست سے ترتیب پاتی ہے۔(۲۱)

بنیادی طور پر علامت کی ابتداء جو شہر کی تحریک سے شروع ہوئی کیونکہ انہوں نے فطرت کو Symbol کے روپ میں دیکھا یہ تحریک ۱۸۸۵ء میں جو دبشیر کی تحریروں میں دیکھی گئی اس کے بعد ایڈگر ایلن پو کی تحریروں نے اسے تقویت دی۔ فرانس میں بودلیئر، ریمبو، ملارے، پال وھیری اور ایزرا پاؤنڈ علامت بندی کے حوالے سے مشہور ہیں۔ وزیر آغا نے علامت کی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

> "سمبلزم کی تحریک ۱۸۸۵ء میں شروع ہوئی فرانس میں اس کے علم برداروں میں بودلیئر، ملارمے، وریسن رپن بودو غیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ انگلستان میں زریٹی بیسٹر، وائلر اور ایٹس نے اس تحریک کے اثرات قبول کیے۔ جرمن میں میربالکی اور اسٹیفن چارج اس سے متاثر ہوئے اور روس میں الیگزنڈر نے اسے اپنایا۔ سیمالزم کی یہ شاعری دراصل علامتوں کی بجائے صدیوں کے استعمال سے ایک خاص تلازمہ خیال کو جنبش میں لانے کا باعث بن چکی تھی اور جن کے پس منظر سے قاری پوری طرح واقف ہو چکا۔"(۲۲)

اردو مختصر افسانہ اور علامت نگاری فیچر علامت نگاری کی اس تحریک نے سب سے پہلے شاعری اور بعد میں افسانے اور ناول کو متاثر کیا۔ علامت کے حوالے سے ویلیس فاؤل اپنی کتاب "ملارمے" میں کہتے ہیں:

> "علامت نگاروں میں ایسے ایسے تضادات ملتے ہیں کہ مجھے شبہ ہے کہ کیا کبھی علامت نگاری کا کوئی سکول وجود میں تھا بھی یا نہیں؟"(۲۳)

شاعری میں انیس کی نظم "آمد نو" میں علامت کے متعلق بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں اس کے علاوہ شاعری میں علامت نگاری کے حوالے سے اہم نام "میراں جی" کا ہے میراں جی شاعری میں بھی علامت نگاری کو بہت زیادہ اپنایا گیا ہے ان کی ایک نظم علامت نگاری کے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

حوالے سے بہت زیادہ اہم ہے وہ ہے "سمندر کا بلاوا" سمندر کا بلاوا میں جس طرح سے علامت کو برتا ہے وہ نہ قابل بیان ہے۔ اس کے علاوہ میر تقی میر، غالب، علامہ اقبال کی شاعری کو دیکھیں تو اس میں بھی علامت کسی نہ کسی طرح نظر آتی ہے۔

جامع انسائیکلو پیڈیا نے علامتی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے یہ ذہن تفصیل کو پیش کرنے کی بجائے اشاراتی انداز اختیار کرتی ہے یہ ایک عارضی اور مبہم صورت حال کو بیان کرتی ہے یہ ایک دوسرے ربط رکھنے والی خیالی شبیہوں کو ابھارتی ہے جن کی تشریح آسانی سے نہیں کی جاسکتی۔ یہ متزلزل لیکن عمیق جذبات کو ابھارتی ہے۔(۲۴)

علامت نگاری کی تحریک نے جس طرح ہر طبقۂ فکر میں اپنی جگہ بنائی اور تمام دبستانوں میں جس شعوری کاوش کے ساتھ لاشعور کی گتھیوں کو سلجھایا اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

> "نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر Paraphrase کرنا حکمت نہیں۔"(۲۵)

اردو ادب میں جدیدیت کا بہت عمل دخل ہے اور اردو افسانے میں جدیدیت نے بہت زیادہ دخل اندازی کی جس کی وجہ سے اردو افسانے میں جدیدیت نے ان کے فنی اسلوب اور فنی ڈھانچے کو بہت زیادہ بدلا ہے۔ اس تبدیلی نے ہی افسانے میں استعاراتی، رمزیت، ایمائیت، اشاریت اور شعریت کے عناصر کو جنم دیا اس سے افسانے میں ادھورے ان کہے فقروں کا استعمال زیادہ ہوا۔ جس سے افسانہ نگاروں نے پیکر تراشی تشبیہ اور استعارہ پر خصوصی توجہ دی جس سے افسانہ نے تمثیلی انداز اختیار کیا۔ اس وجہ سے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں داستانوی انداز کے علاوہ اساطیری رنگ کو بھی جگہ دی۔ افسانوں تلاش ذات کا جس طرح سے آغاز ہوا وہ علامت نگاری کا ہی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے بقول:

> "جدیدیت کے رجحان نے اردو افسانے میں فنی و فکر سطح پر انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں لیکن اس کے سارے پھل میٹھے نہ تھے۔ تجربوں کے جوش اور بغاوت کے خروش میں نئی پود نے ایسے حربے آزمائے جو افسانے کی افسانویت کے منافی تھے۔ بڑی خرابی یہ ہوئی جدیدیوں نے اسلوب میں جدیدیت کو اہم سمجھا اور مواد کی اہمیت کو فراموش کر دیا۔ یہ ترقی پسندوں کے خلاف رد عمل اور ان سے آگے نکلنے کا ایک غیر صحتمندانہ رویہ تھا۔"(۲۶)

اردو افسانہ کی دنیا میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے سب سے زیادہ علامت کو اپنے افسانوں میں برتا یا آسان الفاظ میں اردو افسانہ میں علامت کے ابتدائی، تاثراتی ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاں زیادہ ملتے ہیں کیونکہ اردو افسانے میں علامت کی روایت انیسویں صدی ہے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

اس وقت ملک گیر اصلاحی تحریکیں عروج پر تھیں اور بیسویں صدی کے آتے آتے ان تحریکوں نے شدت اختیار کر لی، اور ہر کوئی معاشی زندگی کے استحکام کیلئے کوشش کر رہا تھا ہر کسی نے اُس دور میں زندگی کے مختلف وسائل کو افسانے کا موضوع بنایا۔ اردو ادب میں علامت نگاری کس طرح داخل ہوئی اس حوالے سے شہزاد منظر "جدید اردو افسانے کے رجحانات" میں لکھتے ہیں:

> "پاکستان میں ۱۹۵۱ء سے مختلف طریقوں سے شہری آزادیوں کو کچلنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ اسی دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے چند سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں علامت نگاری کا رجحان واضح ہونا شروع ہوا۔"(۲۷)

اس کے علاوہ حیدر ملک علامت نگاری کے حوالے سے کہتے ہیں:

> "قدیم داستانوں کے بعض کرداروں کو ہم عصر ماحول میں نئی زندگی عطا کی گئی یا ان کے بعض واقعات کو اپنے زمانے سے Relate کیا گیا آسمانی صحائف، دیومالا، اساطیر کے علاوہ دوسرا طریقہ فطرت اور مظاہر فطرت میں سے بعض اشیاء چرند پرند کو علامتی شکل میں پیش کرتا رہا ہے۔"(۲۸)

لہٰذا اس دور میں (ترقی پسند) افسانہ نگار معاشرتی مسائل کو افسانوی انداز میں اور اساطیری انداز کو علامت نگاری کے ذریعے پیش کر رہے تھے۔ اس حوالے سے اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> "اس دور میں ایک طرف معروضی حالات وواقعات سے اور اظہار پر قدغن کے نتیجے میں علامتی افسانہ لکھا گیا تو دوسری طرف اس دور کے افسانہ نگاروں کو اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا۔"(۲۹)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، اقبال مجید، رشید امجد، شوکت حیات، جدیدیت سے وابستہ افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، انور سجاد، بلراج منرا وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے علامت نگاری میں خوب نام کمایا۔

ساٹھ کی دہائی سے پہلے احمد علی کا "میرا کمرہ"، منٹو کا "پھندن"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ" عزیز احمد کا "مدن سینا اور صدیاں"، اختر اورینوی کا "کچلیاں اور بال جبریل" کرشن چندر کا "اسرائیلی تصور"، ممتاز شیریں کا "میگھ ملہار" جیسے متعدد علامتی افسانوں کی اشاعت نے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت کی تہہ در تہہ کیفیتوں کو پیش کرنے کیلئے ایک علامت ہی موثر وسیلہ ہے۔ علامتی افسانے کی ترسیل کے حوالے سے بنت سے مسائل پیدا ہوئے کیونکہ علامتی افسانے کے ابلاغ کی ترسیل کو عام قاری نہیں سمجھ سکتا جس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد علامتی افسانے لکھنے والوں میں انتظار حسین کا نام بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے انہوں نے بہت سے افسانوں میں علامت کو استعمال کیا ہے ان کے افسانے "آخری آدمی" علامت نگاری کے حوالے سے ایک شاہکار افسانہ ہے۔ آصف فرخی بھی اسی رجحان کے علمبردار ہیں آصف فرخی نے علامت کا استعمال اپنے افسانوں میں برمحل کیا ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں کے عنوانات سے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

ایسے لگتا ہے کہ اس میں کوئی کہانی ہو گی لیکن اس میں علامت کا استعمال جس طرح سے کیا گیا ہے وہ نا قابل بیان ہیں۔ آصف فرخی کے افسانوں میں مذہبی علامت زیادہ ملتی ہیں جیسے ان کا ایک افسانہ "کوفے کا شہری" ایسا افسانہ ہے جس کے عنوان سے ایسے لگتا ہے کہ اس میں مذہبی واقعات یا علامت کے حوالے سے کسی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس افسانے میں عام پاکستانی حالات وواقعات کو علامت کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

آصف فرخی بنیاد طور پر افسانے کی دنیا کے وہ روشن ستارے ہیں جنہوں نے ادب کو صحیح معنوں میں اوڑھنا بچھونا بنا دیا۔ آصف فرخی کثیر جہتی شخصیت ہیں جو بیک وقت استاد، افسانہ نگار، مرتب اور مدیر ہیں۔ آصف فرخی کے لئے افسانوں میں حقیقت، واقعیت، علامت، تجریدیت کے خوبصورت اور کامیاب تجربے کیے ہیں۔ آصف فرخی کے افسانے "دیمک" کو شاہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے علامت کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

> "ان کی سرخ رنگ کی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑی ابھی گلی سے مڑی ہو گی، میں پھاٹک بند کر کے اندر جانے ہی والا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی میں نے دیکھا۔۔۔ وہی مٹی کا نشان اور اس سے پھوٹتی ہوئی کیکر کی ٹہنی جیسی لکیر۔۔۔ دیمک۔"(۳۰)

ایک اور جگہ اس دیمک کی علامت کو استعمال کرتے ہوئے دیمک کی علامت کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔

> "اس کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا ابھی اتنی جلدی دیمک آن پہنچی اور جو میں نے اتنا خرچ کیا تھا وہ سب بے کار گیا۔ کیا ہم کبھی دیمک سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ کیا دیمک ہماری چیزوں کو کھاتے کھاتے ہمیں بھی نگل جائے گی۔"(۳۱)

دیمک کی علامت آصف فرخی نے اس لیے لی ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی علامت ہے اس سے عوام اور خواص دونوں طبقہ کے لوگ واقف ہیں اور آسان فہم بھی ہے۔ بعض اوقات افسانہ نگار ایسی علامتیں استعمال کرتے ہیں جو عام قاری کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آصف فرخی کے علاوہ ان کے ایک اور افسانے "زمین کی نشانیاں" میں بھی علامت کو خوب برتا گیا ہے۔ مثلاً:

> "یہ بلی ان لوگوں کی ہے" امی نے کہا اس مکان کا ایک ماضی تھا بلی اس میں سے آئی تھی۔
> میں اپنی جگہ نہیں چھوڑتی" ابا کہنے لگے کتنے لوگوں سے مانوس ہوتے ہیں مگر بلی کی انسیت گھر سے ہوتی ہے بلیلاں ہجرت نہیں کرتیں۔ گھر والے چلے بھی جائیں تب بھی وہیں لوٹ کر آتی رہتی ہیں۔"(۳۲)

ان کے افسانے "سوتے جاگتے" میں بھی علامات کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں جیسا کہ:

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

"دیکھا کہ ہر ایک اپنی دھن میں دوڑا جاتا ہے" کوئی اس طرح عام تحریر میں غوطہ زن نہیں۔ کسی نے اسے نام لے کر پکارا کہ چلنا ہے کہ نہیں۔۔۔ یہ نام میرا ہے، اور مجھے کسی سے کچھ کام ہے؟ وہ کھڑا سوچا کیا لوگ آگے نکل گئے۔ ابوالحسن دبدھے میں رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک اور منظر ہر چیز میں ایک موہوم سی آشنائی، مانوسی سی اجنبیت، یہ یہاں کیسے آئی اور میں کہاں۔۔۔ خواب دیکھا تھا؟ وہ خواب تھا تو پھر یہ کیا ہے اور یہ خواب ہے تو وہ کیا تھا؟ آنکھیں بند ہوتی ہیں تو کہیں ہوتا ہوں آنکھ کھلتی ہے تو کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔"(۳۳)

آصف فرخی کے افسانے "یزید کی پیاس" میں بھی انہوں نے علامت کو اپنایا ہے کیونکہ یزید ایک مذہبی علامت ہے، مثال کے طور پر:

"صدیقی صاحب نے ترش روئی سے جواب دیا یہاں نہیں ہے پانی۔ عورت خوشامد کرنے لگی دے دینا ذرا سا بچہ پیاسا ہے۔ صدیقی صاحب بگڑ گئے کہہ جو دیا یہاں کوئی پانی وانی نہیں ہے۔ عورت واپس جانے لگی تو جاتے جاتے ہونٹ پچکار کر بولی ذرا سا پانی پینے کو نہیں دیتا یزید کہیں کا۔۔۔۔"(۳۴)

آصف فرخی کے افسانے زمین کی نشانیاں میں بھی علامت کی بھرمار ملتی ہے یوں تو بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں علامت کو استعمال کیا گیا ہے لیکن آصف فرخی نے جس طرح سے افسانہ کی روش سے ہٹ کر اور کسی بھی دبستان سے خود کو منسلک نہ کرتے ہوئے علامت نگاری میں بھی ایک الگ قسم کی پہچان بنائی ہے۔ ان کے افسانوں میں بنیادی طور پر اساطیر، دیومالا اور سماج کو علامت بنا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں۔ یورپی ادبا نے بھی اپنی علامتیں زیادہ تر یونانی دیومالاؤں سے حاصل کی ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ نجی علامتیں بھی وضع کی ہیں۔ جس کی بنا پر ایسی علامتیں ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی استعمال کی ہیں اس طرح کے افسانے کی خوبصورت مثال ان کا افسانہ "باب خروج ہے"۔ مثال کے طور پر:

"دس گمشدہ قبیلوں کے ساتھ کچھ یوں ہوا ہو گا کہ بیل گاڑیوں میں بندھی لالٹینوں کی چمنیاں راستے کی دھول سے اٹ گئی ہوں گی، کوئی بچہ پیاس سے رویا ہو گا اور ڈھلتی شام کے دریا میں خون کا دریا، آسمان سرخ ہو گیا ہو گا تو وہ کہیں پہنچے بغیر مک گئے ہوں گے بہت دنوں تک انہوں نے بچھڑی بستی کو یاد کیا ہو گا۔۔۔ دس گمشدہ قبیلے دراصل کھوئے نہیں ان کے نئے پاسپورٹ جاری ہو گئے۔"(۳۵)

آصف فرخی کے بہت سے افسانوں میں حکایات، اساطیر، تلمیح وغیرہ کو اپنایا گیا ہے۔ جبکہ انہیں حکایات، اساطیر وغیرہ کو بنیاد بنا کر آصف فرخی علامات تراش لیتے ہیں۔ اس طرح کے افسانوں میں اصحاب کہف، شہر کتاب خوار، کوفے کا شہری، السلام علیکم یا اھل القبور، صلوۃ المخلوق میں علامات کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

"تب سے وہ غار میں صدیوں کی نیند سوتے ہیں اور ایسے غافل ہیں کہ مطلق خبر نہیں کہ کون زمانہ بیت گیا اور جب نکلی ہے تو بچ کے جاتی ہے۔"(۳۶)

اس کے علاوہ "شہر کتاب خوار" میں علامت کی کچھ اس طرح مثال ملتی ہے:

"شہر کتاب خوار میں وہ چند لوگ جو کتاب ہو گئے تھے ان میں سے ایک بیٹھے بٹھائے کل ہوا اور ایک دن اپنے ساتھیوں سے جولایا رو میرے پیٹھ پر کھلی بہت ہوتی ہے کسی کے ناخن بڑے ہوں تو میری پیٹھ پر کھجلی کرو۔ تب اہلیان دمشق نے دیکھا اس کی پشت پر دیمک لگی ہوئی ہے۔"(۳۷)

افسانہ "کوفے کا شہری" میں اس طرح علامت کی مثال ملتی ہے:

"وہ چپ چاپ چلتے رہے ان کے قدموں کی چاپ خالی گلیوں میں گونج رہی تھی جس شخص نے آسمان کو خون روتے ہوئے دیکھا تھا وہ چپ نہ رہ سکا اور اپنے کسی ساتھی کو براہِ راست مخاطب کر کے بولا اے رفیق تو نے آسمان کو دیکھا؟ دوسرے نے گردن گھما کر دیکھا اور بولا واقعی خون کبوتر کی مثل ہو رہا ہے، تیسرے نے کہا یہ اچھی علامت نہیں۔"(۳۸)

آصف فرخی کے افسانوں میں مذہبی علامتیں بھی موجود ہیں۔ مذہبی علامتوں کے ساتھ ساتھ تاریخی حقائق بھی علامتوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ تاریخی علامت نگاری کے حوالے سے آصف فرخی کا افسانہ "جلتے شہر میں بانسری کی دھن" مشہور افسانہ ہے یہ افسانہ کسی قوم کے عروج وزوال کے تلخ حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی عکاسی بھی کرتا ہے وہاں تیرو تھا جو چلتے شہر سے بے خبر تھا۔

"جب اس نے شعلوں کو رقص کرتے اور تھرکتے دیکھا تو اس کے دل میں لہر اٹھی اس نے ترنگ میں آکر بانسری اٹھالی اور شعلوں کی ہیبت ناک موسیقی کا ساتھ دینے لگا۔"(۳۹)

"شرم الشیخ" افسانے میں علامت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"جن کے دیو ہیکل زدہ بکتر کے سامنے کوتاہ قامت داؤد کھڑے قلاخن میں پتھر گھما رہے ہیں۔ وہ کس جانب تھے انہیں یقین نہ تھا سوائے اس خناس کے جو بہت قوی تھا کہ وہ اپنے تئیں معجزوں والی امت گردانتے تھے اور جنگ بھی ان کیلئے یوں ہو گئی جیسے قیلولے میں دکھائی دینے والا خواب۔۔۔ یا اخی سونے کی پوجا کرو، آؤ سرمائے کی پوجا کرو۔۔۔"(۴۰)

"محاصرہ" افسانے میں بھی علامت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو کراچی کی حالت کی واضح طور پر عکاسی کر رہا

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

ہے، لیکن ایک پیغام ہے جو عوام انسان تک علامت کے ذریعے دیا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر:

"فون رکھتے ہوئے میرے ذہن کے گرد ایک سوال نے اپنا گھیرا تنگ کر دیا۔۔۔ میرے شہر سے میری ماں کی دعا کا سایہ کیوں اٹھ گیا ہے۔"(۴۱)

آصف فرخی کے ایک اور افسانے "جشن مرگ انبوہ" میں اس طرح علامت نگاری کی مثال ملتی ہے:

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سربرآوردہ افراد نہ رہے تو شہر کی سڑکوں کے نام کس پر رکھیں گے۔

ہماری تو قوم یتیم ہو گئی۔

مگر اب کیا ہو گا، مجمع بول اٹھا:

ہائے غضب کہ ہمارے ہیرو نہ رہے۔

ان کے بغیر تو ہم کہیں کے نہ رہے ہم کیا کریں؟"(۴۲)

ایک اور مثال دیکھئے:

"پہلے شخص نے کہا یا اخی ایوں بے عزت تو نہ کرو، میں کوفہ کا معزز شہری ہوں، اور یہ پیش قبض حاشا وکلا کسی بری نیت سے نہیں دیکھا۔ اسے تو ہمارے قبیلے کے لوگ مرد کا زیور جانتے ہیں اور ہمہ وقت دم کے ساتھ رکھتے ہیں کوفے میں ایسے کتنے ہی لوگ ہیں۔۔۔ گریبان چھوڑ کر بات کرو۔۔۔ یہ خنجر تو عادتاً۔۔۔"(۴۳)

آصف فرخی کے حوالے سے ڈاکٹر قاضی عابد کہتے ہیں:

"نئی نسل نے جس کے آصف فرخی نمائندہ ہیں انحراف کرتے ہوئے اپنی معروض حالات میں زیادہ تر سیاست کو ہی مرکز میں رکھا یوں علامت کیا وہ سلسلہ جو ہندوستان کی اجتماعی لاشعوری دنیا اور اساطیر سے ابھرا تھا وہ ذاتی نوعیت کے علائم اور اساطیر میں ڈھل گیا۔ آصف فرخی کے افسانے اسی منظرنامے کا حصہ ہیں ان کی کہانیوں میں مارشل لاء کے دور کا کراچی سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"(۴۴)

آصف فرخی اردو ادب کے افق پر ساٹھ کی دہائی میں طلوع ہونے والے وہ روشن ستارے ہیں کہ جنہوں نے ادب کو حقیقی معنوں میں اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ وہ ایسی کثیر جہت شخصیت ہیں جو بیک وقت استاد، افسانہ نگار، تنقید نگار، مرتب، مدیر، مترجم ہیں۔ اردو افسانے میں انہوں نے تجریدیت، علامت نگاری، اساطیریت کے بہت زیادہ تجربے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تنقید میں بھی نام کمایا بطور مترجم بھی ان کا کارنامہ اپنی مثال آپ ہے۔ ساٹھ کے عرصے میں جتنی بھی تبدیلیاں آئیں مارشل لاء لاگو ہونے کی وجہ سے پابندی کے باعث ان کے افسانوں میں علامت نگاری نے بھی اپنی جگہ بنائی۔ انہوں نے علامت کے ذریعے سے اپنے افسانوں میں معاشرتی مسائل کراچی کے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

حالات کو اپنے افسانوں میں علامت بنا کر پیش کیا۔ بنیادی طور پر آصف فرخی کا اسلوب سادہ اور آسان ہے جس کی بنا پر ان کے افسانوں کو ایک عام قاری بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کیونکہ قاری کیلئے علامت کو سمجھنا دشوار ہو سکتا ہے۔ لیکن آصف فرخی کے علامتی افسانے پڑھتے وقت اس چیز کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

آصف فرخی بنیادی طور پر کسی ایک رجحان کے تحت لکھنے والے افسانہ نگار نہیں بلکہ وہ دبستان سے ہٹ کر الگ اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں جس کی وجہ سے افسانے کے اس ازدحام میں اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ بہت سے افسانہ نگار جو دوسروں کی تقلید کرنا شروع کرتے ہیں اور افسانے کی دنیا میں اپنا نام بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جبکہ آصف فرخی نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت بہت سے لوگ لکھ رہے تھے لیکن انہوں نے کسی کی تقلید یا کسی دبستان کی پیروی نہیں کی جس بنا پر انہیں افسانے کی دنیا میں الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔

اس حوالے سے اسد محمد خان کہتے ہیں:

> "آصف فرخی کا وژن کشادہ ہے اسی وجہ سے ان کی کوئی بھی تحریر لکھتے ہیں تو وہ زیادہ معنی چیز ہوتی ہے اس تکنیک کو وہ زیادہ مہارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔"(۴۵)

آصف فرخی کا مشاہدہ بھی بہت زیادہ ہے جس نظر سے وہ چیزوں کو دیکھتے ہیں اس طرح ایک عام آدمی کی نظر وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد کہتے ہیں:

> "آصف فرخی کا مطالعہ صرف کتابوں تک محدود نہیں بلکہ اس کا مشاہدہ بھی ہے بین الاقوامی ادبی دنیا میں جو کہ اس کے مشاہدہ ہے اس نے اس کے تخیل اور افسانوی صلاحیتوں کو بہت dich کیا ہے۔"(۴۶)

یہی وجہ ہے کہ آصف فرخی نے ادبی دنیا میں اپنی تحریک ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ علامتی افسانے کے ابلاغ میں دشواری صرف اس لیے نہیں ہے کہ قاری ذہنی طور پر باشعور اور بیدار مغز نہیں بلکہ سب سے بڑی دشواری اس لیے ہے کہ جدید افسانہ نگاروں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو محض تقلید یا فیشن کے طور پر علامتی افسانہ لکھ رہے ہیں۔ علامتی افسانے کو دو قسم کے لکھنے والوں نے نقصان پہنچایا ہے ایک وہ نئے افسانہ نگار جن کا مطالعہ نہایت محدود ہے اور جو علامت نگاری سے واقف نہیں اور جو علامتی افسانے کے نام سے اناپ شناپ لکھ رہے ہیں۔ دوسرے وہ پرانے افسانہ نگار جو روایتی طرز کے افسانے لکھتے رہے جن کی عمر کا بڑا حصہ بیانیہ اور وضاحتی طرز کے افسانے لکھنے میں فرق ہو چکا ہے لیکن انہوں نے تقلید میں علامتی افسانہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ان دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کا اصل ذات کا اظہار صرف شہرت کی طلب ہے۔

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 1 (2025)

حوالہ جات

۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۴۔ اختر اورینوی، ڈاکٹر، تحقیق و تنقید، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۳

۵۔ احتشام حسین، پروفیسر، اعتبارِ نظر، کتاب پبلشرز، لکھنو، ۱۹۶۵ء، ص ۱۳۴

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۲۰

۷۔ ایضاً، ص ۱۹

۸۔ وقار عظیم، پروفیسر، فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،، ص ۲۲

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹

۱۲۔ محمد ضمیر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، اردو مختصر افسانہ اور علامت، شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۵

۱۳۔ نثار احمد ڈار، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، اردو افسانوں میں علامت نگاری، اساطیریت اور تجریدیت کا تنقیدی جائزہ، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدر آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۶

۱۴۔ محمد عقیل، سید، نئی علامت نگاری، انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۸۶

۱۵۔ رفعت اختر، ڈاکٹر، علامت سے امیج تک، نازش بک سنٹر، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۱۶۔ ابن فرید، علامت کا تصور مشمولہ: سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، ص ۱۹۶

۱۷. The Literary Symbol, William Tioders, New York, 1995, P

۱۸۔ رفعت اختر، ڈاکٹر، علامت سے امیج تک، ص ۴۵

۱۹۔ مجید مضمر، ڈاکٹر، اردو کا علامتی افسانہ، نیو لیتھو آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳، ۱۴

۲۰۔ رفعت اختر، ڈاکٹر، علامت سے امیج تک، ص ۴۲

۲۱۔ محمد ضمیر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، اردو مختصر افسانہ اور علامت، ص ۵۴

۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ اور علامت نگاری، مشمولہ: علامت سے امیج تک از رفعت اختر، نازش بک سنٹر، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۵۴

۲۳۔ محمد عقیل، سید، نئی علامت نگاری، انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۳۰

۲۴۔ نثار احمد ڈار، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، اردو افسانوں میں علامت نگاری، اساطیریت اور تجریدیت کا تنقیدی جائزہ، ص ۶

۲۵۔ گوپی چند نارنگ، نیا اردو افسانہ، انتخاب تجربے اور مباحث، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۲

۲۶۔ شفیق انجم، اردو افسانہ بیسویں صدی کی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۴

۲۷۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۲، ۳۵۱

۲۸۔ علی حیدر ملک، افسانہ اور علامتی افسانہ، عاکف بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۶۸

۲۹۔ رفعت اختر، ڈاکٹر، علامت سے امیج تک، نازش بک سنٹر، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۵۵

۳۰۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، مجموعہ آصف فرخی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۲۵۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۱۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۶۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۴۰۔ ایضاً، ص۹۹

۴۱۔ ایضاً، ص۴۶۶

۴۲۔ ایضاً، ص۱۲۸

۴۳۔ ایضاً، ص۱۶۸

۴۴۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، مشمولہ: مجموعہ آصف فرخی از ڈاکٹر آصف فرخی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، فلیپ

۴۵۔ اسد محمد خان، مشمولہ: مجموعہ آصف فرخی از ڈاکٹر آصف فرخی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، فلیپ

۴۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، مشمولہ: مجموعہ آصف فرخی از ڈاکٹر آصف فرخی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، فلیپ